زراعت اور کسان کا المیہ

ذوالفقار احمد چیمہ

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے جس کی ۶۵ فی صد آبادی کی گزربسر زراعت پر ہے۔ اگر ایسے زرعی ملک کے کسان بلبلا اُٹھیں اور کاشت کار چیخ رہے ہوں کہ حکومت کو ان کے مسائل کا اِدراک نہیں اور اربابِ بست وکشاد کو ان کے دُکھ درد کا احساس نہیں تو یہ ایک الم ناک صورتِ حال ہے۔

اس وقت وطن عزیز کی پانچوں بڑی فصلیں: چاول، کپاس، گندم، گنا اور آلو بدترین بحران کا شکار ہیں۔ پچھلے دو برسوں سے چاول برآمد نہیں ہوسکا، پرانے اسٹاک گوداموں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے کاشت کار کو پچھلے سال کی نسبت چاول کی آدھی قیمت بھی نہیں مل سکی۔ پچھلے سال باسمتی مونجی ۲۵۰۰ روپے من بکتی رہی، جب کہ اس سال کسان کے لیے وہی مونجی ۱۲، ۱۳ سو روپے فی من بیچنا بھی مشکل تھا۔ کپاس کی کاشت پر فی ایکڑ تقریباً ۴۴ ہزار روپے اخراجات آتے ہیں، جب کہ کاشت کار کو ۲۰ سے ۲۲ ہزار روپے فی ایکڑ قیمت وصول ہوئی، جو اخراجات سے کہیں کم ہے۔ گندم کی سرکاری قیمت خرید ۱۳۰۰ روپے فی من مقرر ہے مگر کھیت میں کاشت کار کو دو سے تین سو روپے فی من کم ملتی رہی ہے۔ گنے کی فصل اچھی تھی مگر شوگر ملوں کے مالکان نے کاشت کاروں کو ان کی محنت کا صحیح معاوضہ نہیں دیا، لہٰذا انھیں گنے کے بہت کم نرخ مل سکے۔ آلو کے کاشت کار نے جب اندازہ لگایا کہ فروخت کے بعد وصول ہونے والی رقم اس پر اُٹھنے والے اخراجات سے کہیں کم ملے گی تو اس نے آلو کی فصل کو منڈی تک پہنچانے کی زحمت ہی نہیں کی اور پکی ہوئی تیار فصل کو ہل چلا کر زمین کے اندر ہی دفن کر دیا۔ یہ ہے اس ملک کے اس کاشت کار کی کہانی جو برفانی راتوں، جان

لیوا حبس اور چلچلاتی دھوپ میں ہل چلا کر ملک کے کروڑوں باشندوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خوراک مہیا کر رہا ہے۔

کچھ عرصے سے اجناس کی برآمد رُک گئی ہے جس کے باعث سفید پوش کسان عرش سے فرش پر آ گرا ہے۔ غربا و مساکین کو خیرات و صدقہ دینے والے کنبے خود صدقہ و خیرات کے محتاج ہو گئے ہیں۔ ایسے ہی ایک سفید پوش گھرانے کے ایک بزرگ پچھلے دنوں بتا رہے تھے: ''چند سال پہلے تک اللہ کے فضل سے فصل اچھی ہوتی تھی اور نرخ بہت اچھے مل رہے تھے''۔ پھر یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ''مگر اب کاشت کاروں کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ہم دو وقت کی روٹی کے محتاج ہو گئے ہیں''۔

بلاشبہہ اس ملک کو قدرت کی طرف سے بے پناہ نعمتیں اور وسائل میسر ہیں۔ یہاں کے موسم اور مٹی قدرت کا اَنمول تحفہ ہیں۔ رواں دواں دریا اور رواں نہریں موجود ہیں۔ مگر بے نیاز حکومتوں، قومی جذبے سے عاری نوکر شاہی، فاتر العقل منصوبہ سازوں اور ذاتی مفادات کے غلام عوامی نمایندوں نے مل کر اس کی زراعت کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

جدید تحقیقی اداروں کی اہمیت

زرعی شعبے کی ترقی کے لیے جدید طرز کی ریسرچ اور تحقیقی ادارے بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں زرعی تحقیق کے ادارے کبھی بہت فعال ہوتے تھے، حکومت کا رویہ ہمدردانہ اور سرپرستانہ تھا۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا تھا، اس لیے ان کی کاوشوں کے ثمرات کسانوں تک پہنچتے تھے۔ اب یہی ادارے حکومت کی عدم توجہی کا شکار ہیں۔ اس ضمن میں نیشنل ایگریکلچرل ریسرچ سنٹر میڈیا کا موضوع بنا رہا ہے۔ زراعت جیسے اہم ترین شعبے کی تحقیق کے لیے مختص جگہ پر کسی بیوروکریٹ کی ہوس ناک نظریں پڑ گئیں اور اس نے کچھ مقامی سیاست دانوں کو ساتھ ملا کر زراعت کے لیے مختص زمین پر بھی اپنے لیے پلاٹ لینے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ زرعی تحقیق کے لیے مخصوص جگہ ہتھیا کر اُس پر ہاؤسنگ کالونی بنانے کی سازش کی گئی۔ ہوس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی زرعی تحقیق کے لیے وفاقی سطح پر چند قومی ادارے

قائم کیے گئے۔ ۱۹۷۵ء میں نیشنل ایگری کلچرل ریسرچ سنٹر کی بنیاد رکھی گئی۔ یو ایس ایڈ کے تعاون سے اس ادارے کو جدید بنیادوں پر استوار کیا گیا اور ۱۰ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد اس سنٹر نے عالمی معیار کی حامل جدید ترین لیبارٹریز، تجرباتی پلانٹس، گرین ہاؤسز، گلاس ہاؤسز اور اینمل شیڈز پر مشتمل ایک متحرک نظام قائم کرلیا۔ یہ ادارہ ملک کا ایک قومی اثاثہ ہے جو دنیا کے ۱۷۰۰/اداروں میں اٹھارھویں نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔

یہ ادارہ زرعی تحقیق، فوڈ سیکورٹی، پیداوار میں اضافے اور معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کررہا ہے۔ اس میں ۴۰۰ سے زائد اعلیٰ تعلیم یافتہ سائنس دان اور ۸۰۰ سے زائد دیگر ملازمین کام کررہے ہیں۔ نیشنل ایگری کلچرل ریسرچ کونسل کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ اس تحقیقی ادارے نے ملک کو اربوں روپے کا فائدہ پہنچایا ہے اور کئی فصلوں کی بیماریوں کا تدارک کیا ہے۔ متعلقہ حکام کا کہنا ہے کہ جاپان کے تعاون سے یہاں منفرد 'جین بنک' قائم کیا گیا جو ملکی غذائی تحفظ کا اہم ترین ستون ہے اس میں ۳۵ ہزار سے زائد جرم پلازمز (germplasms) ہیں۔

اس ادارے نے ۱۹۹۵ء سے اب تک ملکی پولٹری صنعت کو تباہی سے بچانے کے لیے ویکسین تیار کی۔ ۲۰۰۸ء میں قائم شدہ 'قومی ادارہ برائے پولٹری امراض' نے پاکستان کو برڈ فلو سے پاک ملک ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ اس کے بعد پاکستان سے شرق اوسط کے ممالک میں پولٹری مصنوعات برآمد کرنے پر پابندی اُٹھالی گئی۔

پاکستان ہر سال تقریباً ۱۲/ارب روپے کا ٹماٹر بھارت سے درآمد کرتا ہے۔ 'ریسرچ سنٹر' کسان بھائیوں سے مل کر زیادہ پیداواری صلاحیت رکھنے والے ٹماٹر کی اقسام اور پیداواری ٹکنالوجی کو متعارف کروا رہا ہے جس کے تحت ابتدائی طور پر ۴۰ مقامات پر ۸۰ کسان خاندانوں کو تربیت دی جارہی ہے جس سے نہ صرف خطیر زرمبادلہ بچانے میں مدد ملے گی بلکہ کسان بھی خوش حال ہوگا۔ اسی ریسرچ سنٹر نے کینولا، سرسوں، اسٹرابری (توتِ فرنگی)، انگور اور زیتون کی کاشت متعارف کروائی ہے جس سے ملکی معیشت کو اربوں روپے کا فائدہ پہنچے گا۔ اس ادارے نے اطالوی حکومت کے تعاون سے زیتون کی ترویج و ترقی کے لیے ایک منصوبہ مکمل کیا ہے جس کی بنیاد پر حکومت پاکستان نے قومی سطح پر ایک جامع منصوبہ منظور کیا ہے جس کے تحت ملک بھر میں موزوں

مقامات پر ۵۰ ایکڑ پر زیتون کی کاشت کی جائے گی۔ پاکستان سویابین اور سویامیل کی درآمد پر ہرسال ۶۵ ارب روپے خرچ کرتا ہے۔ NARC نے ملکی سطح پر سویابین کی ترویج و ترقی کے لیے جامع منصوبہ ترتیب دیا ہے جس کے تحت ابتدائی طور پر ۲۰۰ ٹن بیج پیدا کرلیا گیا ہے جس کے بے پناہ فوائد سے اس فصل کو وسیع رقبے پر کاشت کرنا ممکن ہوگا۔

اس ادارے نے گندے پانی کو قابلِ استعمال بنانے کی ٹکنالوجی متعارف کروائی ہے۔ اس کے تیارکردہ 'ہاٹ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ' کی بدولت وطن عزیز آم برآمد کرنے والا بڑا ملک بن گیا ہے۔ ۲۰۱۴ء میں ۹۱ ملین ٹن ریکارڈ برآمد کی گئی، جب کہ پڑوسی ملک پر بدستور پابندی عائد ہے۔

اس ادارے کا مزید دعویٰ ہے کہ اس نے نیشنل ایگری کلچرل ریسرچ سسٹم کے تحت گندم، چاول، مکئی، کپاس، کماد، دالیں، چارہ جات، تیل والی فصلیں، سبزیوں اور پھلوں کی ۶۰۰ سے زائد نئی اقسام اور ہائبرڈ تیار کرنے میں مدد کی ہے۔ جس کی وجہ سے ملکی معیشت کو اربوں روپے کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ ٹشوکلچر ٹکنالوجی سے وائرس سے پاک کیلے کے لاکھوں پودے تیار کررہا ہے کی بنیاد پر کیلے کی فصل کو صوبہ سندھ میں جدید خطوط پر استوار کیا جارہا ہے۔ یہ قومی ادارہ ہرسال ملک بھر سے سیکڑوں کسانوں اور سائنس دانوں کو جدید تکنیکی تربیت بھی فراہم کرتا ہے۔

زراعت قومی پیداوار (جی ڈی پی) میں ۲۲ فی صد ہے اور جو ۶۵ فی صد لوگوں کو روزگار مہیا کرتی ہے۔ اس کی اہمیت کسی طرح بھی ایٹم بم سے کم نہیں۔ یاد کیجیے سوویت یونین کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا، جس نے سیکڑوں ایٹم بم بنا لیے، چاند ستاروں پر کمندیں ڈال لیں، لیکن خوراک کی عدم فراہمی کی وجہ سے سوویت یونین کے طور پر اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔

زراعت کی بہتری کے بغیر معیشت میں کبھی بہتری نہیں آسکتی اور زراعت میں بہتری اعلیٰ معیار کی ریسرچ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ۲۰۰۱ء تک پاکستان میں کپاس کی پیداوار بھارت سے زیادہ تھی۔ بھارت سالانہ ۱۲ ہزار ملین گانٹھیں، جب کہ پاکستان ۱۳ ہزار گانٹھیں پیدا کرتا تھا مگر بھارت نے بہتر بیج پیدا کرلیا جس کی مدد سے اب اُس کی سالانہ پیداوار ۳۵ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اسی طرح مستند اور بہتر بیج کے باعث بھارت میں گندم اور چاول کی فی ایکڑ پیداوار ہم سے دگنی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کے زرعی تحقیق کے

اداروں پر توجہ دی جائے۔ انھیں فنڈز مہیا کر کے ہدف دیے جائیں اور کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے نگرانی کا موثر نظام وضع کیا جائے۔

مجوزہ اقدامات

یہ ایک بڑا قومی المیہ ہے کہ وزارتِ تجارت بیرونی منڈیاں تلاش کرنے میں ناکام ہے، جس کے باعث چاول برآمد نہیں ہوسکا اور پچھلے دو سال سے گوداموں میں پڑا خراب ہو رہا ہے۔ اس کے تین طریقے ہیں: اوّل یہ کہ مونجی کی اگلی فصل کی سرکاری قیمت (سپر باسمتی مونجی کی قیمت ۲۲۰۰ روپے فی من اور باسمتی ۸۶ کی ۱۴۰۰ روپے فی من) مقرر کردی جائے اور حکومت پاسکو کے ذریعے خود مونجی خریدے۔ دوسرا یہ کہ ڈیلرز کے پاس پڑا ہوا چاول حکومت خرید کر خود برآمد کرے ورنہ پھر سبسڈی یا چھوٹ کے ذریعے ڈیلروں کی مدد سے یہ کام کیا جائے۔ چند ارب روپے کی حکومتی امداد سے چاول کا سنگین بحران حل ہوسکتا ہے۔ حکومت اور قوم کو یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وطن عزیز کو خوراک کی خود کفالتی حیثیت سے محروم کرنا عالمی ساہوکاروں کا پرانا ایجنڈا ہے اور اپنے اس ہدف کے حصول کے لیے وہ براہِ راست یا بالواسطہ ہماری قومی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔

اس وقت بھی ایسے لگتا ہے کہ زرعی شعبے کے پالیسی ساز اداروں میں کچھ ملک دشمن عناصر موجود ہیں جن کی بے جا مداخلت سے اس اہم سیکٹر کو کئی طرح سے نقصان اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف ہماری زرعی آمدنی اخراجات کے مقابلے میں کم ہو رہی ہے۔ جی ڈی پی میں زرعی شعبے کا حصہ ۲۴ فی صد سے کم ہوکر ۲۱ فی صد رہ گیا ہے۔ شعبۂ زراعت کی افرادی قوت جو کوئی دوسرا کام نہیں جانتی بے روزگاری کا شکار ہے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ملک کو خوراک کی فراہمی کم ہو رہی ہے۔ بلاروک ٹوک انتہائی زرخیز زرعی زمینوں پر ہاؤسنگ کالونیاں بنائی جارہی ہیں جس سے زیرکاشت رقبہ سمٹ رہا ہے اور خوراک کی فراہمی مزید کم ہو رہی ہے۔ زرعی ماہرین سمجھتے ہیں کہ اگر حکومتوں کا زراعت کے شعبے کے ساتھ اسی طرح بے نیازانہ رویہ رہا اور ہماری پالیسیاں زمینی حقائق کے برعکس بنتی رہیں تو آیندہ چند برسوں میں ہماری فوڈ سیکورٹی کے حالات انتہائی خطرناک ہوجائیں گے۔

تمام صوبائی اور مرکزی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ کاشت کاروں کو وہ تمام سہولیات فراہم کریں جن سے فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہو۔ اس ضمن میں معیاری بیج کی فراہمی، مناسب نرخوں پر کھاد کی دستیابی، کم نرخوں (subsidised rates) پر ٹریکٹر، تیل اور بجلی کی فراہمی اور کسانوں کو ان کی محنت کے معقول معاوضے کی فوری ادائیگی، کسانوں اور کاشت کاروں کا حق ہے، جو انھیں ہرصورت ملنا چاہیے۔ حکومت زراعت کی اہمیت سمجھتے ہوئے اسے اپنی ذمہ داری سمجھے۔

بدلتے ہوئے موسمی حالات کے مطابق نئے بیج تیار کرنے اور بیماریوں سے مدافعت کے لیے مؤثر دوا اور سپرے کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ آزادی کے ۶۸ سال بعد بھی کاشت کاروں کو کسی بھی فصل کے لیے ۱۰۰ فی صد سرٹیفائیڈ سیڈ (مصدقہ بیج) میسر نہیں۔ ابھی تک صرف ۲۰ فی صد کاشت کار مصدقہ بیج استعمال کر رہے ہیں۔ اس بیج کے استعمال سے فصل کی نمو اور فی ایکڑ پیداوار میں زبردست اضافہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کاشت کار کو مارکیٹ سے جو بیج اور ادویات ملتی ہیں وہ زیادہ تر غیر معیاری یا جعلی ہیں۔ اس کے علاوہ بیج اتنا مہنگا ہوگیا ہے کہ اسے خریدنے کے لیے کاشت کار کو قرض درکار ہوتا ہے۔ کاشت کاروں کو آسان اقساط پر قرضے دینا بے حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کو چاہیے کہ تمام زرعی بنکوں کو پابند کرے کہ وہ بیج کے لیے دیے جانے والے قرضے کو نقد رقم کے بجاے سیڈ کارپوریشن کے نام ووچر دے تاکہ کاشت کار بیجائی کے لیے لازماً مستند بیج استعمال کریں۔ نیز کاشت کار کو میڈیا کے ذریعے مستند بیج اور قابلِ اعتماد دوائیوں کی اہمیت اور فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ کپاس، گندم اور گنے کے ماہرین جدید بیج کے نام پر ہرسال سیڈ مافیا سے کروڑوں روپے بٹور رہے ہیں۔ وہ تنخواہ اور مراعات حکومت سے لے رہے ہیں، مگر اچھا بیج بنا کر پرائیویٹ کمپنیوں کو فروخت کردیتے ہیں۔ ایسے کرپٹ عناصر کا کڑا احتساب ہونا چاہیے۔ یہ کمپنیاں اعلیٰ معیاری بیج تیار کرنے والے سائنس دان سے ملی بھگت کر کے اپنی ناقص اور دونمبر دوائیاں (جن پر یورپ میں پابندی لگ چکی ہے) یہاں کھلے عام بیچ رہی ہیں۔ اس کا فوری تدارک بہت ضروری ہے۔

فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کے لیے کھاد بنیادی ضرورت بن چکی ہے مگر اس کے نرخ کسان کی پہنچ سے باہر ہو رہے ہیں۔ گذشتہ پانچ برسوں میں یوریا کے نرخ میں ۲۹۳ فی صد اور فاسفیٹ

کھاد میں ۲۸۹ فی صد اضافہ ہوا ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کھاد کے استعمال میں ۲۰ فی صد کمی ہوگئی ہے جس سے فی ایکڑ پیداوار متاثر ہوئی ہے۔ ہمسایہ ملک میں بیج، کھاد اور بجلی کی فراہمی میں کاشت کاروں کو دل کھول کر سبسڈی دی جارہی ہے جس سے ان کی فی ایکڑ پیداوار ہم سے دگنی ہے۔

پاکستان اور بھارت میں کھاد اور بجلی کے نرخوں کا موازنہ ملاحظہ فرمالیں:

بھارت کے صوبہ پنجاب میں زراعت کے لیے بجلی بالکل مفت ہے، جب کہ گجرات میں ایک روپیہ فی یونٹ اور راجستھان میں ڈیڑھ روپیہ فی یونٹ کے حساب سے فراہم کی جارہی ہے، جب کہ ہمارے ہاں زرعی مقاصد کے لیے کاشت کاروں کو ۱۰ روپے ۳۵ پیسے فی یونٹ کے حساب سے بجلی مل رہی ہے۔ غریب کاشت کاروں کے لیے بجلی کے نرخ ناقابلِ برداشت ہیں، جس کی وجہ سے زیادہ تر کاشت کاروں نے بجلی کے کنکشن کٹوا دیے ہیں اور وہ بیچارے دوبارہ ڈیزل انجن کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ اگر اسے ہمسایہ ملک جیسی امداد اور سہولتیں میسر آجائیں تو یہاں یقینی طور پر سبز انقلاب آجائے گا اور ہماری معاشی ترقی کا گراف آسمان کو چھونے لگے گا۔

پانی کے بغیر زراعت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پانی کی صورتِ حال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں صوبہ پنجاب کو ۵۴ فی صد نہری پانی مل رہا تھا جو ۱۹۹۱ء میں صوبوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کے بعد ۴۸ئ۹ فی صد رہ گیا ہے۔ اب ناکافی پانی کی وجہ سے کاشت کار کو ٹیوب ویلوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان کے کُل کاشتہ رقبے کا ۷۰ فی صد سب سے بڑے صوبے میں ہے۔ نہری اور ٹیوب ویل کے پانی کی کوالٹی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ۷۰ فی صد ٹیوب ویلوں کا پانی آب پاشی کے لیے غیر موزوں ہے۔ نیز یہ نہری پانی سے ۱۸ سے ۲۵ فی صد زیادہ مہنگا ہے، جس کی وجہ سے کاشت کار کا خالص منافع کم ہوجاتا ہے۔ اس وقت ہمیں پانی کی کمی کے بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے۔ ہمارا ملک ۹ ملین مکعب فٹ سے زائد پانی کی کمی کا شکار ہے۔ دونوں بڑے ڈیموں میں مٹی جمع ہونے سے پانی ذخیرہ کرنے کی گنجایش کم ہوتی جارہی ہے۔ گذشتہ ۳۸ سال سے کوئی نیا ڈیم نہیں بنا۔

دنیا بھر میں کسانوں کو رعایتی قیمت اور اجناس کی مددگار قیمت ملتی ہے۔ کاشت کار کی

سبسڈی کی مخالفت کرنے والے نام نہاد معیشت دانوں کے علم میں شاید یہ بات نہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں سب سے زیادہ سبسڈی زرعی شعبے میں دی جاتی ہے۔

زراعت سے متعلق تحقیقی اداروں کا بجٹ بڑھایا جائے اور ان کی ضروریات کے مطابق انھیں فنڈز فراہم کیے جائیں، مگر ساتھ ہی ان کی کارکردگی کی سختی سے نگرانی کی جائے۔ چاول کے پاکستان کے تحقیقاتی اداروں پر لازم قرار دیا جائے کہ وہ ایک سال میں چاول، کپاس اور گندم کے ہائبرڈ بیج (جس سے فی ایکڑ پیداوار میں کم از کم ۳۰ فی صد اضافہ ہو) تیار کر کے کاشت کاروں کو فراہم کریں۔ ہدف حاصل کرنے والے ماہرین کو انعامات اور ترقیاں دی جائیں اور نااہلوں اور کام چوروں کو نوکریوں سے فارغ کیا جائے۔

زرعی ترقیاتی بنک کو اس طرح فعال اور کارآمد بنایا جائے کہ کاشت کار صحیح معنوں میں اس کی خدمات سے مستفید ہوسکیں۔ تمام صوبوں میں زراعت کے محکمے کو متحرک کیا جائے اور زراعت کے اہل کاروں کا کسان کے ساتھ دوبارہ تعلق استوار ہو۔ کسان، محکمہ زراعت اور زرعی بنک کے درمیان رابطے کے فقدان کو ختم کر کے ان کے درمیان قریبی، مفید اور مستقل رابطہ استوار کیا جائے۔ چھوٹے کاشتکار کو آڑھتی کے استحصال سے بچایا جائے اور آڑھتی کا مناسب کمیشن حکومت مقرر کرے۔

سیم اور تھور کے خاتمے کے لیے کبھی بڑے زور شور سے مہم چلا کرتی تھی۔ ہر دو لعنتوں کے خلاف بڑی مؤثر کارروائی ہونی چاہیے۔ کسی زمانے میں نہروں اور راجباہوں کی بھل صفائی بھی باقاعدگی سے ہوا کرتی تھی، اب وہ بھی قصۂ پارینہ بن گئی ہے۔ صوبائی حکومتیں اس طرف توجہ دیں اور نہروں کو پختہ کرنے کے طویل مدتی منصوبوں پر بھی عمل درآمد کریں۔ نیز سیلاب کی روک تھام کے لیے طویل مدتی منصوبے بنائیں۔

سندھ میں بُری گورننس کی وجہ سے نہری پانی کی چوری بڑے دھڑلے سے ہو رہی ہے۔ اس لیے ٹیل پر پانی دستیاب نہیں ہوتا، خاص طور پر بدین، تھرپارکر اور میرپور خاص میں پانی کی عدم دستیابی بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ صوبائی حکومت اس کا تدارک کرے۔

اٹھارھویں ترمیم اور زراعت و تعلیم

آئین کی اٹھارھویں ترمیم کے محرک اور حامی غالباً اُس وقت اس کے مضر اثرات کا اندازہ

نہ کر سکے۔ صوبوں کی خودمختاری بجا مگر خودمختاری کے نام پر ریاست اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے دست بردار ہی ہوجائے ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ دنیا کے تمام ممالک میں توانائی کے وسائل پر صوبوں کا نہیں مرکزی حکومت کا کنٹرول ہوتا ہے۔ مگر اٹھارھویں ترمیم میں توانائی پر بھی صوبوں کا کنٹرول تسلیم کرلیا گیا ہے، جس سے آئے روز مسائل پیدا ہورہے ہیں۔

دنیا بھر میں تعلیم کا شعبہ وفاقی حکومت اپنے پاس رکھتی ہے اور نوجوان نسل میں قومی سوچ پیدا کرنے اور یکساں سمت متعین کرنے کے لیے تعلیمی نصاب مرکزی حکومت تیار کرتی ہے۔ اسی طرح فوڈ سیکورٹی اور قومی زرعی پالیسیاں تشکیل دینے کے حوالے سے زراعت ایک قومی شعبہ ہے مگر اٹھارھویں ترمیم کے حامیوں نے اس کے مضمرات کا اندازہ کیے بغیر یہ اہم ترین شعبے صوبوں کے حوالے کر دیے۔ اسٹاف کالج میں اس ترمیم کے سب سے بڑے وکیل رضا ربانی صاحب سے کورس کے شرکا نے پوچھا کہ فوڈ سیکورٹی مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے اور تعلیمی نظام ایک قوم بنانے کا بنیادی ذریعہ ہے۔ آپ نے پاکستان کو اس سے کیوں محروم کر دیا ہے؟ ربانی صاحب نے دلیل سے جواب دینے کے بجاے ایک جذباتی تقریر کر ڈالی، جس پر ایک دوست نے کہہ دیا: ''آپ جذباتی خطبے سے ہمیں مرعوب کر سکتے ہیں مگر قائل نہیں کر سکتے''۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ تعلیم، زراعت اور توانائی کے شعبوں کو اٹھارھویں ترمیم کے شکنجے سے آزاد کرایا جائے اور ان اہم شعبوں پر مرکز کی نگرانی بحال کی جائے۔

مضمون نگار سابق انسپکٹر جنرل پولیس نیشنل ہائی ویز اور موٹرویز ہیں